ہماری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ : اللہ کی ذات خالق اور باقی ساری کائنات مخلوق ہے۔ اللہ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص : ۸۸)

"ہر شے ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اس کے روئے انور کے"۔

نیز فرمایا :

﴿وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمٰن : ۲۷)

"اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے"۔

گویا کہ ہر شے فانی ہے' باقی صرف وہی ہے' ازلی و ابدی وجود صرف اسی کا ہے۔ وہ تنہا ہے اپنی ذات میں' اپنی صفات میں' اپنے حقوق میں' اپنے اختیارات میں' اور وہ کسی کو اپنے اختیارات میں شریک نہیں کرتا "وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا" (الکہف : ۲۶) البتہ ساری کائنات حادث اور فانی ہے' ایک وقت پر پیدا ہوئی اور ایک خاص وقت کے لئے ہے' ہمیشہ کے لئے نہیں ہے :

﴿مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُسَمًّى﴾ (الاحقاف : ۳)

"ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدتِ خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے"۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کیلئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ذیل ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سائنس کی بے خدائیت کے خلاف
اقبال کا جہاد

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

اقبال دور حاضر کا سب سے پہلا مفکر ہے جس نے سائنس کی بے خدائیت (Godlessness) کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ وہ پر درد الفاظ میں کہتا ہے ؎

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

یہاں علم سے اقبال کی مراد سائنس ہے اور کوئی دوسرا علم نہیں۔ چنانچہ اقبال خود اپنے خطوط میں ایک جگہ لکھتا ہے :

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے۔ یہ علم، علمِ حق کی ابتدا ہے"۔

اقبال کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عشق کی تیغ جگردار سائنس کی نیام کے اندر اپنی جگہ پر موجود تھی اور بعد میں یہ افسوسناک حادثہ پیش آیا کہ کسی نے اس تلوار کو اس نیام سے اڑا لیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نیام اب تک خالی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف ہے جو سارٹن (Sarton) اور برِفو (Briffault) کی تحریروں سے اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سائنسی علوم کے بانی اور سائنسی طریق تحقیق کے موجد سپین کے مسلمان تھے۔ اور یہ مسلمان سائنس کے موجد اس لئے بنے تھے کہ ان کی مقدس کتاب قرآن حکیم نے ان کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں، کیونکہ ان کا

مشاہدہ اور مطالعہ خدا کی معرفت کا سب سے پہلا ذریعہ ہے۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ خدا کی ہستی اور خدا کی صفاتِ جمال و جلال کے نشانات مظاہر قدرت کے اندر آشکار ہیں۔ چنانچہ انہوں نے خدا کی معرفت کی جستجو میں مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا اور اس سے جو نتائج حاصل کئے ان کو ضبط تحریر میں لائے ۔ آج اسی قسم کے نتائج کو ہی ہم سائنس کا نام دیتے ہیں۔ چونکہ دنیا کے ان پہلے سائنس دانوں کی سائنس خدا کے عقیدے سے پیدا ہوئی تھی لہٰذا وہ خدا کے عقیدہ کے ارد گرد ہی گھومتی تھی۔

جب ہسپانوی مسلمانوں کے سیاسی حالات نے پلٹا کھایا اور وہ سپین سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس یورپ کے ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو پولوسیت (Paulism) یا جدید عیسائیت کے پیرو تھے۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں ہیں' ایک پاک اور مقدس ہے اور دوسری ناپاک اور غیر مقدس۔ لہٰذا دنیا کے علم کو جسے سائنس کہا جاتا ہے خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس اور سائنس دانوں سے کلیسا کی گہری اور آشکار دشمنی نے اس عقیدہ کے لئے مزید ثبوت بہم پہنچایا اور کلیسا اور ریاست کے افتراق نے' جو دونوں کے طویل اور شدید جھگڑوں کے بعد ایک اٹل حقیقت کے طور پر رونما ہوا تھا' اس عقیدہ کو تقویت دی اور اس کے لئے راستہ صاف کیا۔ لہٰذا اس عقیدہ نے جامۂ عمل پہنا اور سائنس سے خدا کا نام خارج کر دیا گیا۔ یہ کلیتِ وجود میں تفریق پیدا کرنے اور خود حقیقتِ کائنات کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ایک نامعقول اور ناپاک جسارت تھی جس کے پیچھے کوئی علمی یا عقلی دلیل موجود نہ تھی۔ تاہم سائنس کی بے خدائیت کا عقیدہ جو اس طرح عیسائیت کے بطن سے پیدا ہوا تھا' عیسائی مغرب کی دنیا میں متمکن ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ سائنس میں اس عقیدہ کے جاگزیں ہونے کے بعد کوئی ایسے سائنسی نظریات پیدا نہ ہو سکتے تھے جو اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ لہٰذا ایسے سائنسی نظریات وجود میں آنے لگے جو دراصل اسی کی پیداوار تھے لیکن جن کو آسانی سے اس کا ثبوت سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسے سائنسی نظریات میں ہم انیسویں صدی کی طبیعیاتی مادیت اور میکانیت کو اور ڈارون کے میکانکی اور مادی نظریہ ارتقاء کو شمار کر سکتے ہیں جنہوں نے اس خیال کو بظاہر ایک سائنسی حقیقت کا درجہ دیا کہ قدرت میں کوئی تخلیقی یا راہنما قوت موجود نہیں اور

خدا کا عقیدہ بظاہر دونوں کی تشریح کے لئے غیر ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ یہ بھول گئے کہ سائنس کی بے خدائیت در حقیقت ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کو عیسائیت نے جنم دیا تھا اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ خود سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے۔

اب بھی عیسائی مغرب کے سائنس دان ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنی سائنس کو ہر حالت میں اس راستہ سے بچائیں جو خدا کے عقیدہ کی طرف جاتا ہے اور خواہ کچھ ہو جائے اس کو سختی کے ساتھ اس چار دیواری کے اندر بند رکھیں جو سائنس کی بے خدائیت کے نامعقول عقیدہ نے اس کے ارد گرد بنا رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ایسے حقائق کو نظر انداز کرتے ہیں جو قدرت میں کسی ذہنی یا تخلیقی قوت کی کار فرمائی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں، خواہ وہ ثبوت کتنا ہی بیّن اور آشکار کیوں نہ۔ مثلاً وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ قدرت میں یہ سب چیزیں موجود ہیں، تنظیم، ترتیب، تجویز، تعمیر، تکمیل، وحدت، یکسانیت، تسلسل، مقصدیت، تطابق، توافق، جمالی فکر، ارتقائی حرکت، زندہ حیوانات کی خودکارانہ نشوونما جو ان کو برتر اور بلند تر مدارج حیات کی طرف خود بخود لے جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں کسی ذہنی قوت کے عمل کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوتیں تو طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم ممکن ہی نہ ہوتے۔ اس کے باوجود وہ ان کے وجود سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی تشریح نہیں کرتے، کیونکہ سائنس کی بے خدائیت کے مفروضہ کے ہوتے ہوئے وہ ان کی کوئی معقول تشریح نہیں کر سکتے۔ اگر وہ کبھی ان حقائق سے سخت مجبور ہو جائیں تو وہ ان کی تشریح کے لئے خدا کے تصور کو کسی حالت میں بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ کچھ من گھڑت اور فرضی مابعد الطبیعیاتی تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جیمز جینز "ریاضیاتی ذہن" کو فرض کرتا ہے، برگسان کسی "قوتِ حیات" کا نام لیتا ہے اور ڈریش کسی "عالمی سکیم" یا "انٹی لیچی" کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہ تمام تصورات ناکافی اور ناتسلی بخش ہیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات میں کوئی اعلیٰ درجہ کا ریاضیاتی ذہن تو کار فرما ہو لیکن اس میں شخصیت کے دوسرے اوصاف مثلاً جذباتی یا اخلاقی موجود نہ ہوں، یا قدرت میں کوئی ایسی قوت اجسامِ حیوانات کی تخلیق اور تکمیل کے کاموں میں مصروف ہو جو سوچتی سمجھتی ہو، اپنے مقاصد سے آگاہ ہو اور ان کو حاصل

کرنے کی قدرت رکھتی ہو لیکن ایک کامل شخصیت نہ ہو۔ ہمارا تجربہ اس قسم کے لنگڑے تصورات کی نفی کرتا ہے' کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضیاتی فکر اور مقصدیت کے اوصاف جس وجود میں ہوتے ہیں وہ شخصیت کے باقی ماندہ جذباتی اور اخلاقی اوصاف سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ للذا ہم قرآن حکیم کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ قدرت میں جو ریاضیاتی ذہن یا قوت حیات کارفرما ہے وہ خدا ہی ہے۔ لیکن سائنس کی بے خدائیت کا مذہبی عقیدہ مانع ہے کہ مغرب کے سائنس دان بات ایسے الفاظ میں کہیں۔

اگرچہ بے خدا سائنس یہ نہیں کہتی کہ خدا موجود نہیں' لیکن وہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس طرح سے کرتی ہے کہ گویا ان کا کوئی خالق نہیں' اور اگر ہے تو اس کی صفات کا کوئی نشان ان کے اندر موجود نہیں۔ اس طرح سے وہ اس دروازہ کو بند کر دیتی ہے جس کی راہ سے خدا کی معرفت اور محبت کا نور سب سے پہلے انسان تک پہنچتا ہے۔ اقبال کا یہ خیال قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے کہ خدا کی معرفت کا پہلا ذریعہ انسان کے حواس ہیں جن کی مدد سے وہ مظاہر قدرت میں خدا کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر ہم خالق اور رب' اور رحیم اور کریم اور عادل' اور حفیظ اور علیم' اور سمیع اور بصیر' اور مومن اور مھیمن ایسے الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکتے جو خدا کی صفات کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے قرآن حکیم کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے۔ حواس کے بعد خدا کی معرفت کا دوسرا ذریعہ ذکر ہے جس کی مدد سے انسان قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر اور مسجد کے ایک کونہ میں بیٹھ کر بھی خدا کی صفات پر غور و فکر کر سکتا ہے کیونکہ وہ پہلے قدرت کے مشاہدہ سے ان الفاظ کے معنی سمجھ چکا ہوتا ہے جو خدا کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اس ذکر سے خدا کا حضور یا خدا کے قرب کا احساس پیدا ہوتا ہے جو عشق یا محبت ہے اور شعور یا ادراک سے بالاتر سطح کی چیز ہے۔ اقبال نے اس مطلب کو ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

علمِ حق اول حواس آخر حضور
آخرِ او مے نگنجد در شعور

ایک اور جگہ وہ اس خیال کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے ؎

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الاَسْمَاء
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سُبحانَ رَبِّیَ الاعلیٰ

الغرض بے خدا سائنس خدا کا انکار کرنے کے بغیر انسان کو اس طرح سے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ خدا موجود ہی نہیں۔ بے خدا سائنس نے ہی اس نامعقول اور بے بنیاد عقیدہ کو رواج دیا ہے کہ ہر معیاری فلسفہ وہی ہے جس میں خدا ایک حقیقت کے طور پر مذکور نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں کائنات کے جس قدر فلسفے پیدا ہوئے ہیں مثلاً ڈارون ازم' مارکس ازم' میکڈوگل ازم' فرائڈ ازم' ایڈلرزم' بی ہیوئیرازم' لاجیکل پازٹیوازم' ہیومن ازم وہ سب بے خدا ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں انسانی فطرت اور انسانی اعمال کے جس قدر نظریات وجود میں آئے ہیں وہ بھی سب کے سب بے خدا ہیں۔ مثلاً بے خدا فلسفۂ سیاست' بے خدا فلسفہ اخلاق' بے خدا اقتصادیات' بے خدا قانون' بے خدا فلسفۂ تعلیم' بے خدا نفسیاتِ فرد اور بے خدا نفسیاتِ جماعت۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی سا' معصوم سا اور بے ضرر سا تغیر نہیں جو صرف کتابوں ہی میں آیا ہو۔ اس نے انسان کی کتابوں کو ہی نہیں بدلا بلکہ اس کے جملہ عقیدوں' قدروں' منصوبوں' مقصدوں اور حق و باطل' نیک و بد اور خوب و زشت کے معیاروں' حتیٰ کہ امیدوں اور آرزوؤں کو بدل کر اس کے اعمال و افعال کو بھی بدل ڈالا ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ جو سوچتا ہے وہی کرتا ہے۔ اگر اس کے افکار و آراء اور اس کے تصورات و نظریات بے خدا ہوں تو اس کے اعمال و افعال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا سائنس کی بے خدائیت عالمِ انسانی کا ایک بہت بڑا حادثہ ہے جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا ہے۔ اسی کی وجہ سے اب دنیا میں کوئی ایسی ہمہ گیر اخلاقی اور روحانی قوت باقی نہیں رہی جو اندر سے انسانی اعمال کو ضبط میں لا کر صحیح راستہ پر ڈال سکے۔ یہی حقیقت ہے جو دورِ حاضر کے انسان کی

تمام بد قسمتیوں اور پریشانیوں کا بنیادی سبب ہے۔ مثلاً عالمگیر جنگوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے میں نہیں آتا' میزائیلوں اور ایٹم بموں کے بڑھتے ہوئے انبار' بین الاقوامی معیار اخلاق کا فقدان' سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب' سیاسی سازشیں اور ان سے پیدا ہونے والے سیاسی قتل اور سیاسی انقلابات' اقتصادی خوشحالی کے باوجود اطمینانِ قلب کا فقدان' اور ذہنی بیماریوں' خود کشیوں اور جرائم کی روز افزوں تعداد' آزاد جنسیت' طفولیتی بے راہ روی' علم اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے ضبط و نظم کا بگاڑ وغیرہ۔ اس وقت ہر جدید کالج ایسے نوجوانوں کی تربیت گاہ ہے جو خدا اور مذہب اور اخلاق کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اکبر نے ایسے ہی کالج کے لئے تھا ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور اگر کوئی پوچھے کہ مسلمانوں کے علمی' دینی' اخلاقی اور سیاسی انحطاط کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب کیا ہے تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی سائنس کی بے خدائیت ہے جسے مسلمانوں نے بھی ہر جگہ اپنی یونیورسٹیوں میں اپنا لیا ہے۔ اقبال بڑے سوز اور درد کے ساتھ اپنے ساقی سے کسی ایسے کافر ادا محبوب کی شکایت کرتا ہے جس کے غمزۂ خونریز نے اللہ کا نام لینے والوں کی متاع دین و دانش کو لوٹ لیا ہے ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

یہ کافر ادا محبوب مغرب کا یہی بے خدا علم ہے جس نے مسلمانوں کے فکر کو اللہ سے بیگانہ کر دیا ہے۔

یہی وہ حقائق ہیں جن کی بناپر اقبال نے سائنس کی بے خدائیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں!
علم کو از عشق برخوردار نیست — جز نمائش خانۂ افکار نیست
مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست
تا بجذبِ اندرونش راہ نیست

شیخِ مکتب ہے اِک عمارت گر جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دلپذیر تیرے لئے کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
"پیشِ خورشید بر مکش دیوار
خواہی ار صحنِ خانہ نورانی"

اقبال ہماری توجہ بجاطور پر اس بات کی طرف مبذول کرتا ہے کہ اگر سائنس کو خدا کے تصور پر قائم کیا جائے تو ترقی کرتے ہوئے وہ اپنے غلط نتائج کو خود درست کرتی چلی جاتی ہے۔ بے خدا سائنس میں یہ خاصیت نہیں ہوتی کیونکہ وہ خدا کے تصورت کی راہنمائی اور روشنی سے محروم ہوتی ہے ؎

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم، کم بصری ' جس میں ہمکنار نہیں
تجلّیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

اقبال نے علم اور عشق کی ایک گفتگو نظم کی ہے جس میں وہ اپنے دلکش اشعار کی پوری قوت کے ساتھ سائنس کو خدا کے تصور کے ساتھ متحد کرنے پر زور دیتا ہے۔

سائنس کہتی ہے :

نگاہم راز دارِ ہفت و چار است گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند مرا با آنسوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم
ببازار افگنم رازے کہ دارم

عشق جواب دیتا ہے :

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است ہوا آتش گذار و زہر دار است
چو با من یار بودی ' نور بودی بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی
ولیکن در نخِ شیطاں فتادی